مولانا محمد حنیف ندوی

محتویاتِ قرآن

(۴)

مشرکین

یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ شرک، تنویت اور تثلیث کے شوائب سے پاک اور منزہ ہے سلبی نوعیت کی چیز نہیں، ایک مثبت اور ایجابی حقیقت اور پیغام سے تعبیر ہے۔ یہی وجہ ہے قرآن حکیم نے مشرکین سے اظہار مخاصمہ کرتے ہوئے اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم مخاصمہ کی اس نوعیت سے تعرض کریں اور توحید و شرک کی تفصیلات بیان کریں، یہ ضروری ہے کہ اس مسئلہ کے بارہ میں اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی جائے۔ بات یہ ہے کہ یہ کائنات خود بخود معرض وجود میں نہیں آئی، بلکہ اس کی تخلیق و آفرینش اور تربیت و ارتقا میں اللہ تعالیٰ کے فیوض و کرم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اسی کے وجود باجود سے اس کا وجود اور ظہور ہے اور اسی کی چشم عنایت اور نگاہِ التفات پر اس کارخانۂ ہست و بود کا تمام تر دار و مدار ہے۔ اور الوہیت کی اس صفت اور خوبی میں کوئی بھی اس کا شریک اور ساجھی نہیں۔ توحید کے معنی یہ ہیں کہ انسان اس حقیقت کو پہچانے اور ذاتی سطح پر اس مبدأ فیض سے اپنے تعلقاتِ عبودیت استوار کرے۔ اسی کے سامنے جھکے، اسی کے آگے دستِ طلب بڑھائے اور اسی کی عبادت کرے جب تک انسانی معاشرہ اپنی تگ و دو اور فکر و تدبر کا رُخ اسی کی طرف منعطف رکھے گا اور ہر ہر موڑ پر اس کی دست گیری و اعانت پر بھروسہ رکھے گا۔ اس زندگی کے حسنات اور اُخروی زندگی کے لطائف سے برابر بہرہ مند رہے گا اور جب اس سرچشمۂ حیات اور مبدأ فیض کو چھوڑ کر دوسروں کو خدا ٹھہرالے گا اور ان کی پرستش کرنا شروع کر دے گا تو اس وقت اس کا رشتہ اللہ تعالیٰ سے کٹ جائے گا۔ نیوضِ الوہیت سے محرومی کی اسی صورت

کا نام شرک ہے۔ دوسرے لفظوں میں توحید و شرک کا مسئلہ نظریہ و تصور یا عقیدہ و ایمان کے اختلاف کا مسئلہ نہیں اور اس کے معنی یہ نہیں کہ ایک شخص یا ایک گروہ خدا کو واحد مانتا اور اس کی عبادت کرتا ہے اور دوسرا شخص یا گروہ متعدد آلہ کا قائل ہے اور پرستار ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس مسئلہ کی حیثیت و معنی کا تعین یوں ہوتا ہے کہ جب انسانی معاشرہ توحید کے اسرار کو سمجھ لیتا ہے اور اس کے تقاضوں کو پوری طرح اپنا لیتا ہے تو گویا وہ اپنا رشتہ اس "اخذ حیات"، اس منبع نور اور چشمۂ ہدایت سے جوڑ لیتا ہے جس نے اس پوری کائنات کو بنایا اور ارتقا بخشا ہے اور جب وہ شرک کے ارتکاب سے اس رشتہ کو توڑ لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے زندگی کی روشنی اور ہدایت و توفیق کی ارزانیوں سے منہ موڑ لیا ہے۔ توحید کے اس پہلو پر جب غور کیجیے گا تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جائے گی کہ اس عقیدہ کا تعلق نفسِ انسانیت کے فروغ و ارتقا سے ہے اور شرک کا نفسِ انسانیت کی پستی اور انحطاط سے ہے۔

ومن یشرک باللہ فکانما خر من السماء فتخطفہ الطیر او تھوی بہ الریح فی مکان سحیق۔[1]

اور جو شخص خدا کے ساتھ شریک ٹھہرائے۔ وہ ایسا ہے جیسے کوئی آسمان کی بلندیوں سے گر پڑے پھر اس گوشت پوست کو پرندے اچک لے جائیں یا ہوا اس کو اٹھا کر کہیں دور پھینک دے۔

یہ صحیح ہے کہ توحید اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے اور اس کو تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں کہلا سکتا۔ یہ بھی مسلم کہ اسلام کی برکتوں اور سعادتوں سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان لا الٰہ الا اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور قلب و لسان سے اس چیز کا اقرار کرتا ہو کہ کارگاہِ حیات کو پیدا کرنے والا اپنا کوئی شریک، بدل یا ساجھی نہیں رکھتا۔ تاہم یہ عقیدہ اپنی ہمہ گیر افادیت و اہمیت کی بنا پر اس لائق بھی ہے کہ پورے عالمِ انسانی کے لیے مشعلِ ہدایت بنے۔ یہی وجہ ہے قرآن اس کے فیوض و برکات کے دائروں کو کسی حلقے اور مذہب کی تخصیص و امتیاز

---

[1] الحج : ۳۱

روا رکھے بغیر تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچا دینے کا حامی ہے :

قل یاھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا و لا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون ۲؎

کہہ دیجئے کہ اے اہلِ کتاب آؤ جو بات ہمارے اور تمہارے ہاں یکساں تسلیم کی جاتی ہے، اس پر متفق ہو جائیں ۔ یعنی یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں ۔ اور ہم میں سے کوئی کسی کو کارساز نہ سمجھے ۔ اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو کہہ دیجئے تم گواہ رہو کہ ہم قطعی خدا کے فرمان بردار ہیں ۔

اور تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی توحید کی روشنی میں، دوسرے مذاہب کے فکر و نظر میں خاصی تبدیلیاں ہوئی ہیں ۔ اور اس کے باوجود کہ ان کے ہاں خالص اور نتھری ہوئی توحید کا تصور پایا نہیں جاتا، انھوں نے آخر آخر میں، کسی نہ کسی صورت میں توحید ہی کی حقانیت کا اقرار کیا ہے اور کہا ہے کہ تجسیم اور تعدد کے معنی یہ ہیں کہ شئے وجود اپنے آخری تجزیہ میں کثرت کی حامل ہے ۔ کثرت و تعدد کا تعلق تو محض اظہار و تحقق کی شکل سے ہے جوہر سے نہیں ۔ جوہر و اصل کے اعتبار سے حقیقت بہرحال ایک ہی ہے ۔

قرآن حکیم نے خصوصیت سے توحید پہ کیوں زور دیا ۔ اور کیوں اس کو مسلمانوں کی روحانی اخلاقی اور اجتماعی زندگی کا نقطۂ آغاز قرار دیا ۔ اس کے جواب میں ہم قارئین کی عنانِ توجہ کو ان دو نکتوں کی طرف ملتفت کرنا چاہتے ہیں ۔

(۱) ترتیبِ اشیا کا تقاضا

(۲) قریشِ مکہ کی ذہنی حالت

مذاہبِ عالم پہ غور کیجیے تو معلوم ہوگا ہر پیغمبر و داعی نے اپنے اپنے دور میں قریب قریب تین ہی اشکالات کو وحی و تنزیل کا ہدف قرار دیا ہے ۔ یعنی یہ کہ اس بزم کون کو کس کے

۲؎ آلِ عمران : ۶۴

دستِ ہنر پرور نے ترتیب دیا اور سنوارا ہے یا یہ کہ یہ عالم کیونکر پیدا ہوا اور اس کی تخلیق و آفرینش کا کیا مقصد ہے۔ اور آخر میں یہ کہ اس کرۂ ارض پر بسنے والے انسانوں میں رشتہ و تعلق کی جو مختلف نوعیتیں ہیں، ان کے پیشِ نظر کن فرائض و واجبات اور آدابِ وسلوک کا نقشہ زیادہ موزوں ہے۔

پہلے دو اشکال مابعد الطبیعیاتی نوعیت کے ہیں اور تیسرا اشکال تاریخ یا سماجیات اور تہذیب و تمدن کی باریکیوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مذاہب و ادیان کے بارہ میں جہاں تک ترتیبِ اشیا کا تعلق ہے یہ سوال اولین اہمیت کا حامل ہے کہ ہمارے گرد و پیش پھیلی ہوئی یہ دنیائے رنگا رنگ، یہ مناظرِ دل آویز، یہ نجوم و کواکب، یہ فرشِ زمین، یہ پہاڑ اور زندگی اور شعور کی یہ جلوہ فرمائیاں آخر کس معشوق اور محبوب کی ادائے ناز کا نتیجہ ہیں۔ کیا اس انجمن ہست و بود کی ترتیب میں مختلف آلہہ اور اصنام کا دخل ہے۔ یا کوئی بھی اس کو پیدا کرنے والا اور ترتیب دینے والا نہیں اور یہ محض زمانہ و دہر کی ضرورتوں کا نتیجہ ہے۔ اور یا اس کو خدائے واحد و قدوس نے پیدا کیا اور بنایا ہے۔

قرآنِ حکیم نے عقیدۂ توحید کی وضاحت، تشریح اور تبلیغ سے اس اہم سوال کا تسلی بخش جواب مرحمت فرمایا ہے کہ متعدد خداؤں کو ماننا زیادہ قرین عقل و دانش ہے یا ایک خدا پر ایمان لانا۔ ترتیبِ اشیا سے قطع نظر اس سوال کو اس لیے بھی اولین اہمیت حاصل تھی کہ عرب بالعموم اور قریشِ مکہ بالخصوص شرک و بت پرستی کے مرض میں بُری طرح مبتلا تھے اور نہیں ماننا چاہتے تھے کہ بت پرستی انسانیت کا کتنا بڑا روگ ہے۔ عربوں کے فہم و ادراک کی نارسائی اور سادہ لوحی نے کن کن اصنام و حقائق کو دائرہ لاہوت میں داخل کر رکھا تھا۔ اس پر مستشرقین میں ولہاوزن (Wellhausen) [illegible] کا نام سرِ فہرست ہے۔ مسلمان مصنفین میں ابوالحسن علی بن الحسین بن فضیل بن مروان نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور الجاحظ اور یاقوت حموی نے بھی عربوں میں رائج اصنام کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں حسبِ معمول صرف قرآنِ حکیم کی تصریحات پر ایمان رکھتے ہیں اور اس سلسلہ میں انہی کو مستند اور صحیح سمجھتے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ان کے

مشرکانہ عقائد اور ان کے محرکات کو نہ صرف کھول کر بیان کیا ہے بلکہ ان کے دلائل اور مزعومات پر کڑی گرفت بھی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں خلل و فساد کی مقدار کیا ہے؟

قرآن حکیم کی تصریحات کے مطابق ان آلہہ کو جن کی عرب پرستش کرتے تھے اور جن کو مصائب و مشکلات کے وقت پکارتے تھے اور اپنا حاجت روا سمجھتے تھے، ہم دو واضح خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں، آسمانی اور زمینی۔ آسمانی آلہہ میں فرشتے اور نجوم و کواکب داخل تھے اور زمینی آلہہ میں وُد، سواع، یغوث، لات، منات، عُزیٰ، یعوق اور نسر شامل تھے۔ فرشتوں کے بارہ میں ان کا یہ عجیب و غریب خیال تھا کہ یہ معاذ اللہ اللہ کی بیٹیاں اور دیبیاں ہیں۔

وجعلوا الملائکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثاً[۳]

اور انھوں نے فرشتوں کو کہ وہ بھی خدا کے بندے ہیں، خدا کی بیٹیاں قرار دیا۔

نجوم و کواکب میں سے قرآن نے صرف "شعریٰ" ستارے کا نام لیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کو تو خود پروردگار نے تابش و ضیا بخشی ہے۔ یہ خدا کیونکر ہو سکتا ہے:

وانہ ھو رب الشعریٰ[۴]

اور وہی شعریٰ کا پروردگار ہے۔

زمینی آلہہ کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں ملتا ہے:

وقالوا لا تذرن آلھتکم ولا تذرن وَدّاً ولا سواعا ولا یغوث و یعوق و نسراً[۵]

اور کہنے لگے اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کی عبادت سے کبھی دست بردار نہ ہونا۔

افرءیتم اللّٰت والعزیٰ ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ[۶]

بھلا تم نے لات اور عزیٰ اور تیسرے منوٰۃ کو دیکھا، یہ کہیں خدا ہو سکتے ہیں۔

---

[۳] الزخرف: ۱۹ [۴] النجم: ۴۹ [۵] نوح: ۲۳ [۶] النجم: ۲۰

زمینی آلہہ ہی کی صف میں ان پتھروں کو بھی شامل کرنا چاہیے جو عہد جاہلیت میں قربان گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے انھیں "نصب" کے نام سے پکارا ہے۔

حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر الله به والمنخنقة والموقوذة والمتردیة والنطیحة وما اکل السبع وما ذبح علی النصب [۷]

تم پر مرا جانور اور بہتا لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر خدا کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے۔ یہ سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے۔

شعریٰ جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں ایک روشن ستارے کا نام ہے جو شاید گرمی کے موسم میں جوزا کے بعد طلوع ہوتا ہے۔ اس کا دوسرا نام "مرزم" بھی ہے [۸] کچھ قبائل اس کو کیوں پوجتے تھے، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔

وَدّ ان اصنام میں سے ہے جن کی حضرت نوح کے زمانہ میں پرستش ہوتی تھی۔ [۹] جن کے آگے عرب مدد و نصرت کے لیے دست طلب پھیلاتے تھے اور یقین رکھتے تھے کہ دنیا و آخرت میں ان کے لیے کامیابی و کامرانی کے اسباب فراہم کر سکتے ہیں۔

کیا اس نام کے صنم کو جاہلیت قریبہ میں بھی دینی اہمیت حاصل تھی۔ یا اس دور میں یہ اپنے سابقہ وقار سے محروم ہو چکا تھا۔ اس مسئلہ میں دو رائیں ہیں بعض مستشرقین کا کہنا ہے کہ حضرت نوح کے دور سے متعلقہ تحریروں میں تو اس کا سراغ ملتا ہے، جاہلیت قریبہ میں اس نام کے کسی بت کا پتہ نہیں چلتا تھا، ہمارے نزدیک بوجوہ یہ رائے صحیح نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر اسلام سے کچھ پہلے ود نامی بت کی کوئی اہمیت نہ ہوتی تو قرآن حکیم میں خاص طور پر اس کا ذکر نہ ہوتا۔ دوسرے تاریخی شواہد سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اسلام سے کچھ ہی پہلے عربوں میں اس کی حیثیت خاصی جانی بوجھی تھی۔

چنانچہ نابغہ کے اشعار میں برابر اس کا ذکر ملتا ہے اور تاریخ و سیر کی کتابوں سے بھی معلوم

---

[۷] المائدہ : ۳ [۸] لسان العرب [۹] نوح : ۲۳

تا ہے کہ دومۃ الجندل میں اس کا ایک باقاعدہ معبد اور مندر تھا جس کی دیکھ بھال کے
ے پجاریوں اور کاہنوں کی ایک جماعت مقرر تھی۔ "عمرو بن لحی" نے اول اول اس کو عرب
ئل میں متعارف کرایا تھا۔ مالک بن حارثہ کا کہنا ہے کہ میں نے بچشم خود "ود" دیکھا ہے۔
رے والد (محمد بن سائب الکلبی) مجھے دودھ کا کٹورا دے کر کہا کرتے تھے، اس کو لے جاؤ
ر "ود" کی نذر کرو۔ لیکن میں یہ دودھ خود ہی پی لیتا ۱۱ھ۔ خالد بن ولید جب غزوۂ تبوک
ے لوٹے تو آنحضرتؐ نے ان کو تاکید کی کہ دومۃ الجندل پہنچ کر اس مندر کو گرا دینا اور اس
ں نصب تمام اصنام توڑ پھوڑ ڈالنا۔ چنانچہ انھوں نے جب ود نامی صنم پر تیر چلانا چاہا
ر بنو عبد ود اور بنو عامر نے مزاحمت کی لیکن آپ کے بازوئے بت شکن نے ان کی ایک
مانی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کو توڑ ڈالا گیا۔ قریش اس کو "اد" کے نام سے بھی پکارتے
ے۔ بعض مستشرقین نے اس کا رشتہ یونانی صنمیات سے جوڑا ہے، لیکن یہ محض تکلف اور
فہ طرازی ہے۔ تاریخ سے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہو پاتی۔

سواع، رہاط میں نصب تھا اور بنو ہذیل کا محبوب دیوتا یا محبوب تھا۔ عمرو بن عاص
۔ دستِ توحید آشنا نے اس کو پاش پاش کر دیا۔ ایک روایت کی رُو سے اس کا تعلق قبائل
مدان سے تھا اور اس کو عورت یا دیبی کی صورت میں تراشا گیا تھا۱۲ھ۔ ایک اور روایت میں
ں کا تعلق نعمان سے بتایا گیا ہے جہاں بنو کنانہ، ہذیل اور مزینہ کے قبائل آباد تھے جو
ں کی پرستش کرتے تھے۔ بعض رواۃ نے اس امکان کا بھی ذکر کیا ہے کہ یہ دراصل کسی نیک
سان کا نام ہے جس کے مرنے کے بعد اس کا قائم مقام ایک پتھر سمجھ لیا گیا اور اس کی پرستش
روع کر دی گئی۔

یغوث منجملہ ان اصنام کے ایک تھا جس کو عمرو بن لحی کی وجہ سے شہرت و اہمیت
ماصل ہوئی۔ یہ یمن میں نصب تھا اور بنو غطیف کا چہیتا معبود تھا۔ عرب قبائل میں ایسے

۱۰ھ کتاب الاصنام۔ کلبی ۵۳۔ فتوح البلدان بلاذری ج ۸، ص ۴۹۔

۱۱ھ نیز الاصنام۔ ۵۵
۱۲ھ الکشاف زمخشری، ج ۴، ص ۱۴۳

اشخاص ملتے ہیں جن کا نام عبد یغوث تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اپنے ہاں حیثیت صرف عام معبود ہی کی نہ تھی بلکہ ایسے معروف معبود کی تھی جس سے انتساب کو یہ لوگ وجہِ افتخار سمجھتے تھے اور ایسے نام رکھ کر برکت و تحدث کے متمنی رہتے تھے۔

یعوق: قریۂ خیوان سے تعلق رکھتا تھا۔

نسر۔ عبرانی میں اس کا نام نشر (Nesher) ہے۔ اس کا دراصل تعلق لحیانیوں سے تھا۔ بعض رواۃ کے نزدیک اس کا وطن و مقام فارس تھا، لیکن یہ صحیح نہیں۔ یہودیوں کی مشہور مذہبی کتاب تالمود میں مذکور ہے کہ یہ عربوں کا محبوب بت تھا اور انہی میں اس کی پرستش کا رواج بھی تھا۔

اللات: شمالی عرب کا بہت مشہور بت تھا، جس کے نام پر بنے ہوئے مندر ملک کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اسلام سے کچھ ہی پہلے اس کے اس مندر کو نسبتاً زیادہ شہرت حاصل تھی جو طائف میں نصب تھا۔ یونانی مؤرخ ہیروڈٹس (HERODOTES) نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ بعض کی رائے میں یہ سورج دیوتا ہی کا دوسرا نام ہے جو عربی زبان میں "الشمس" کہلاتا ہے اور اللات کی طرح مؤنث ہے۔ یہ دراصل ایک چوکور سفید پتھر کی صورت میں تھا جس کے بارے میں مختلف کہانیاں اور قصے (اساطیر) مشہور تھے۔ اس کی عربوں میں وہی عزت تھی جو کعبہ کی مسلمانوں میں ہے۔ اس کے کعبینٹ متعدد چیزیں چڑھائی جاتیں، مثلاً زیورات، عمدہ اور نفیس اشیا۔ قیمتی ہار اور تلواریں وغیرہ۔ کعبہ ہی کی طرح اس کے باقاعدہ حاجب اور خدمت گار مقرر تھے جو لوگوں سے نذریں وصول کرتے اور ان کو مختلف کاموں پر صرف کرتے۔ کعبہ ہی کی طرح اس کے لیے ہر سال کسوہ یا چادر کا اہتمام کیا جاتا اور کعبہ ہی کی مانند اس کی زمین کو حرم سمجھا جاتا جس میں کہ یہ نصب تھا۔ خصوصیت سے بنی ثقیف میں اس کو بہت مقبولیت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ ان میں سے جب بھی کوئی شخص سفر سے واپس آتا تو پہلے اس کے ہاں حاضری دیتا پھر گھر لوٹتا۔

اس کی اصل حقیقت کے بارہ میں اہلِ روایت میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک یہ صرف ایک پتھر تھا جس پر ایک شخص بیٹھ کر حجاج کے لیے دودھ اور

بھی بیچتا۔ بعض کی رائے میں عمرو بن لحی خزاعہ کا جدِ اعلیٰ اس کے قریب بیٹھ کر حجاج کے لیے ستو گھولتا اور اس میں گھی ملا کر حجاج کی خدمت میں پیش کرتا۔ اور بعض کا کہنا ہے ثقیف ہی کا ایک نیک آدمی مر گیا۔ اس پر عمرو بن لحی نے مشہور کر دیا کہ یہ شخص مرا نہیں بلکہ اس پتھر میں حلول کر گیا ہے اور زندہ ہے۔ لہٰذا اس کی عبادت کرو۔ عقیدۂ توحید کی اثر آفرینی اور اعجاز ملاحظہ ہو کہ عہدِ جاہلیت میں ابو سفیان اور مغیرہ بن شعبہ لات کے بہت بڑے حامی اور پجاری تھے لیکن جب یہ اسلام لے آئے اور توحید نے ان کے عقائد و نفسیات کی دنیا کو یکسر بدل کر رکھ دیا تو آنحضرت نے یہ خدمت انہی کے سپرد کی کہ اپنے معبد کو یہ اپنے ہاتھ سے گرائیں اور ملیا میٹ کریں اور انھوں نے بطیبِ خاطر یہ خدمت انجام دی۔

عزیٰ : عزیٰ سے کون صنم یا دیبی مراد ہے اس میں بھی اہلِ سیر کا اختلاف ہے۔ ایک روایت کی رُو سے یہ ایک درخت کا نام تھا جسے عربی میں سمرہ کہا جاتا ہے۔ اس کے متعلق عربوں میں تقدیس و احترام کی مختلف کہانیاں مشہور تھیں۔ ایک روایت میں مذکور ہے کہ یہ ایک درخت نہ تھا بلکہ ایک بت تھا جو ایک درخت کے قریب نصب تھا۔ اسحاق انطاکی کا کہنا ہے جو پانچویں صدی عیسوی کا نصرانی ہے کہ یہ ایک ستارہ کا نام ہے جو کوکب الصباح کے نام سے مشہور ہے[۱۳]۔ ابن الکلبی نے کتاب الاصنام میں تصریح کی ہے کہ عربوں میں اجلال و احترام کا جو مقام عزیٰ کو حاصل تھا وہ کسی اور صنم کو حاصل نہیں تھا۔ علامہ طبرسی نے کہا ہے کہ اس کے پرستاروں میں بنو سلیم، غطفان، جشم اور بنو نصر شامل تھے۔ عزیٰ کے نام پر نہ صرف ایک خاص معبد تعمیر کیا گیا تھا بلکہ ایک "منحر" یا قربان گاہ کا بھی سراغ ملتا ہے۔ جس میں جانور ذبح کیے جاتے اور اس کے بھینٹ چڑھائے جاتے تھے[۱۴]۔ فتح مکہ کے بعد خالد بن ولید کے بازوئے بت شکن نے اس کا قلع قمع کیا۔

مناۃ : وہی بت ہے جس کو حضرت علی نے پاش پاش کیا اور "رسوب" و "مخزم" نامی ان دو تلواروں پر قبضہ کیا، جن کو ابی شمر الغسانی نے اس کے بھینٹ چڑھایا تھا۔ یہ

---

[۱۳] تاریخ العرب قبل الاسلام جلد خامس، ص ۱۰۱ [۱۴] ایضاً، ص ۹۷

تلواریں جب آنحضرتؐ کی خدمت میں پیش کی گئیں تو آپؐ نے یہ دونوں حضرت علیؓ کو عطا فرمادیں۔ "ذوالفقار" انہی دو میں سے ایک کا نام ہے، جس نے شعر و ادب اور سیر میں شہرت کا ایک خاص مقام حاصل کیا۔

یہ بت مکہ اور مدینہ کے مابین ساحلِ بحر پر نصب تھا۔ ساحلِ بحر پر کیوں نصب تھا، ممکن ہے اسے پرانے زمانے میں الٰہ بحر تصور کیا جاتا ہو۔ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ اس کی شکل کسی سمندری حیوان سے ملتی ہو۔ اور ایک توجیہہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اسے کشتی کے ذریعہ مصر وغیرہ سے لایا گیا ہو اور یہاں گاڑ دیا گیا ہو۔

بت پرست حلقوں میں اسے بھی وہی مذہبی اہمیت حاصل تھی، جو لات، عزیٰ اور یعوق و یغوث کو حاصل تھی۔ اس کے بھینٹ بھی مختلف نوع کے تحفے چڑھائے جاتے۔ اس کے مقام عبادت کو باقاعدہ زیارت گاہ سمجھا جاتا اور اس وقت تک حج کی تکمیل نہ ہوتی جب تک زائرین یہاں حاضری نہ دیں اور تحلیق کی رسم ادا نہ کریں۔ یوں تو ابن الکلبی کی تصریح کے مطابق تمام عرب اس کا حلقہ بگوشِ عقیدت تھا[۱۵] لیکن اوس و خزرج کے قبائل خصوصیت سے اسے چاہتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ عربوں کی اس اصنام پرستی کا محرک صرف ان کے فہم و فکر کی نارسائی تھی یا اس کے کچھ اور اسباب بھی ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک عربوں کی دینی زندگی کا تعلق ہے یہ تو مسلمہ امر ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند جلیل حضرت اسمٰعیل کی تعلیمات بہرحال توحید ہی کی نشر و اشاعت پر مبنی تھیں اور تعمیر بیت اللہ کے بعد ایک عرصہ تک یہاں توحید ہی کا چرچا رہا، اس لیے کم از کم ان کے بارہ میں یہ شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ یہ اولاً بت پرست تھے، اور اس کے بعد از راہ تجرید عقیدۂ توحید تک پہنچے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف ولیم شمیدٹ (William Schmidt) کو کرنا پڑا[۱۶] جس نے برسوں عرب قبائل کی اسلوبِ زندگی پر غور و خوض کیا۔

---

[۱۵] تاریخ العرب قبل الاسلام، جلد خامس، ص ۸۹ تا ۹۱ [۱۶] ایضاً، ص ۷۶

ہمارے نزدیک عربوں میں اس شدت سے شرک کا رواج دو طرح سے ہوا۔ ایک تو اس لیے کہ یہ انبیا کی اصل تعلیمات کو فراموش کر بیٹھے تھے اور لکھنے پڑھنے کے ان مشاغل ہی سے دست کش ہو گئے تھے جو عقیدۂ توحید کی حفاظت وصیانت کے ضامن ہو سکتے تھے۔ دوسرے جہالت پر قناعت و ناز کرنے کی وجہ سے یہ جس ذہنی پستی کا شکار ہو گئے تھے اس کا منطقی تقاضا یہی تھا کہ توحید کے لطائف اور بلندیوں تک ان کی رسائی نہ ہو پائے۔

اس سے پہلے کہ ہم یہ بتائیں کہ قرآنِ حکیم نے ان کے ان مشرکانہ عقائد پر مخاصمہ کی کیا شکل اختیار کی اور لات و عزیٰ کے پرستاروں کی جبینِ نیاز کو ایک اللہ کے سامنے جھکنے پر کیونکر مجبور کیا، یہ بتا دینا مناسب خیال کرتے ہیں کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے توحید و شرک کا مسئلہ صرف ریاضی کا مسئلہ نہیں، یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں کہ اسلام توحید کی دعوت دیتا ہے اور شرک متعدد آلہہ کا قائل ہے بلکہ اس سلسلہ میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ نظریہ توحید سے انسانی ذہن توہماتِ گوناگوں کی زنجیر سے آزاد ہوتا ہے اور فکر و تدبر کو اپنی پرواز میں وہ بے لاگ معروضیت حاصل ہوتی ہے جو ارتقا کی جان اور روح ہے۔ علاوہ ازیں اس سے شرفِ انسانی بیدار ہوتا ہے اور انسان کو کائنات میں اپنا مقام متعین کرنے کا موقع ملتا ہے اور کہنا چاہیے کہ یہی وہ عقیدہ ہے جو فرقوں، گروہوں اور رنگ و نسل کے خوگر اندیچاریوں کے سامنے وحدتِ انسانی کا خوشگوار تصور پیش کرتا ہے۔

اس کے برعکس شرک سے ذہنوں میں توہمات کی تخم ریزی ہوتی ہے، شرفِ انسانی مجروح ہوتا ہے اور کائنات میں انسان اپنے مقام کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہے۔ بلکہ شرک کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ انسان اپنے رب اور اپنے اس سرچشمۂ حیات سے کٹ جاتا ہے جو زندگی کو فکر و عمل کی تابش وضو سے بہرہ مند کرتا ہے۔ لیکن اس کا کیا جائے کہ انسان نے ہمیشہ محسوس کو غیر محسوس پر ترجیح دی۔ فسانہ کو حقیقت سے زیادہ اہم سمجھا اور صاف ستھری توحید کے مقابلہ میں اصنام پرستی کا الجھا ہوا تصور اختیار کرنے میں زیادہ فخر و ناز محسوس کیا۔

قرآنِ حکیم کی تعلیمات میں توحید اور تردیدِ شرک کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ

یہی دو مسئلے ایسے ہیں جس پر انسانی زندگی کا کاخ بلند تعمیر ہوتا اور گرتا ہے، کیونکہ تہذیب و تمدن کا تمام تر ارتقا انسان کے احساس شرف اور عقل و خرد ہی کی بیداری پر موقوف ہے اور اس بات پر مبنی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی توجہات خاص کو حاصل کرنے میں کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ اور انحطاط کا نقطۂ آغاز وہ شرک ہے جس کی وجہ سے انسان ان تمام نعمتوں سے محروم ہو جاتا ہے۔ توحید و شرک کی اسی تہذیبی اور انسانی اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم نے اسے مرکزی آہنگ کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔

مکے والوں کو جب پہلے پہل حضرت ابراہیم کے اس پیغام کو سننے کا اتفاق ہوا تو اس پر ان کا پہلا اعتراض یہ تھا:

قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ آباءنا [۱۷]

کہنے لگے ہم تو اسی کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آبا کو پایا۔

حسبنا ما وجدنا علیہ آباءنا [۱۸]

جس نہج پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔ ہمارے لیے وہی کافی ہے۔

اعتراض کا یہ انداز بہت قدیم ہے، جب بھی کوئی قوم و ملت نئی روشنی اور نئی دعوت سے دوچار ہوتی ہے۔ یا جب بھی کسی معاشرہ کے سامنے اصلاح و تعمیر کا نیا پروگرام پیش کیا جاتا ہے اس کی رگ عصبیت پھڑک اٹھتی ہے اور وہ اس دلیل کی آڑ لیتی ہے کہ بھلا کیا ہمارے باپ دادا جاہل اور ناواقف تھے جو ان باتوں کو معلوم نہ کر سکے۔ اگر اس پیغام میں فی الواقع صداقت کا کوئی پہلو ہوتا تو سب سے پہلے اس پر لبیک کہنے والے ہمارے بزرگ ہوتے اور جب ان کو یہ بات نہیں سوجھی تو ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتی۔

تقلید آبا، انسانی معاشرہ کا ایک پرانا مرض ہے اور اس میں ہر چند ایک پہلو خیر کا بھی ہے۔ جو یہ ہے کہ اس سے معاشرہ کی روایات، تہذیب و تمدن اور عقیدہ و عمل کے پھیلنے

---

[۱۷] البقرہ: ۱۷۰ [۱۸] المائدہ: ۱۰۴

اور اسلوب قائم رہتے ہیں۔ لیکن اس کا مضر پہلو کہیں زیادہ خطرناک اور مہلک ہے۔
جس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بھی تہذیب اور معاشرہ کی زندگی اور بقا کے لیے یہ نہایت ضروری ہے
کہ وہ خیالات وافکار کے نئے دھاروں سے آشنا رہے۔ تازہ افکار سے زندگی کی نشاط آفرینیوں
میں اضافہ کرتا ہے اور قلب و ذہن کے دریچوں کو کھلا رکھے۔ لیکن وہ معاشرہ جو تقلید
کا خوگر ہو۔ زندگی اور ارتقا کے ان لوازم سے محرومی کی وجہ سے جامد اور ٹھس ہو
جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے بجا طور پر تقلید کی مذمت کی اور کہا کہ تم اسلام کے اس پیغام و
دعوت پر باپ دادا یا اپنے آبا علم و دین کے حوالے سے غور نہ کرو بلکہ اس طرح سوچو کہ
بجائے خود اس پیغام میں کیا معروضی سچائیاں پنہاں ہیں اور اس کو کس حد تک انسانیت
کی سربلندی کا ضامن قرار دیا جا سکتا ہے، اس میں کیا افادیت مضمر ہے یا دلیل برہان اور
معقولیت کے تقاضوں سے کس حد تک اس کی تائید ممکن ہے۔ کیونکہ جہاں تک ماضی
کی روایاتِ کہنہ کا تعلق ہے وہ ہمیشہ صحیح تو نہیں ہوتیں، ان کا غلط اور گمراہ کن ہونا
زیادہ اغلب اور قرین قیاس ہے اور پھر باپ دادا یا تمھارے کاہن جن کو تم اپنے مقتدا
اور پیشوا سمجھتے ہو، اپنے مادی مفادات کے تحفظ و بقا کی خاطر حق سے انحراف بھی تو کرسکتے
ہیں۔ اور دراصل مشرکینِ مکہ نے جو عقیدۂ توحید کے خلاف شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ اس کے پیچھے
منطق کم اور عصبیت کم اور تحفظ مفادات کا خیال زیادہ کارفرما نظر آتا ہے۔ بت پرستی کے اس
نظام میں جو عربوں میں رائج تھا آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ کاہنوں، دینی رہنماؤں اور رسمی قسطوں
کی باقاعدہ ایک جماعت ہے جو پورے ملک میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کی گزر بسر بلکہ عیش
اور ٹھاٹھ کا تقاضا تھا کہ یہ لوگوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھائیں، توہمات کو پھیلائیں اور ان
اصنام کے بارے میں طرح طرح کی فرضی کہانیاں اور قصے تصنیف کریں جن سے ان کی عظمت
کا جھوٹا نقش لوگوں کے دلوں پر کندہ ہو اور یہ کھنچے ہوئے آئیں اور ان اصنام باطلہ کے آستانوں
پر نہ صرف حاضری دیں بلکہ بیش قیمت نذرانے بھی پیش کریں۔ جن سے ایک طرف ان کی
مادی ضروریات پوری ہوں اور دوسری طرف معاشرہ میں بھی ان کو ایک خاص مقام حاصل ہو
اور عربوں ہی پر کیا موقوف ہے تاریخ کا یہ فیصلہ ہے کہ جہاں بھی کوئی انقلاب آفریں آواز

بلند ہوگی اور اس سے معاشرہ میں رچے بسے غلط پیمانوں اور معیاروں کی تردید کے علاوہ کچھ طبقوں کے مفادات کو نقصان پہنچے گا، وہاں ضرور مخالفت ہوگی اور کوشش کی جائے گی کہ یہ آواز پھیلنے نہ پائے۔

مشرکین مکہ کا عقیدۂ توحید سے متعلق دوسرا اعتراض یہ تھا کہ ہم ان اصنام کی عبادت کب کرتے ہیں، ہم تو انھیں بندگی اور تقدس کی محض ایک رمز اور علامت سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ خدا اور اس کی مخلوق کے درمیان وسیلہ اور سفارش کنندگی حیثیت سے ہماری ضروریات اور دعاؤں کو سنتے، جانتے اور اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں ۔ ہم براہ راست انھیں اللہ یا خدا کہاں مانتے ہیں۔

ویقولون ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ[19]

اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کے پاس ہماری سفارش کرنے والے ہیں۔

یہ گویا حق سے گریز کی ایک شکل تھی اور درپردہ اس حقیقت کا اعتراف تھا کہ خدائے قدوس تو اسی ذات بے ہمتا کو ہونا چاہیے جس نے اس عالم رنگ و بو کو پیدا کیا اور ترتیب دیا ہے جس کے قبضہ قدرت میں ہر شئی ہے اور جو ہر آن سنتا، جانتا اور اپنے بندوں کی حاجت پروری کرتا رہتا ہے ۔ توسل و شفاعت کا مسئلہ تو رہا ایک طرف، یہ لوگ جن بتوں اور بزرگوں کو پوجتے تھے اور جن کے آگے دست طلب دراز کرنا عبادت گردانتے تھے ان کی بے چارگی اور ضعف کا کیا عالم تھا ۔ قرآن حکیم نے اس کی نہایت مؤثر پیرایہ میں تصویر کھینچی ہے :

ان الذین تدعون من دون اللہ لن یخلقوا ذبابا ولو اجتمعوا لہ ط وان یسلبھم الذباب شیئا لا یستنقذوہ منہ ط ضعف الطالب والمطلوب[20]

جن لوگوں کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو، وہ ایک مکھی بھی نہیں بنا سکتے، اگرچہ اس غرض کے لیے سب جمع ہو جائیں اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھڑا لے جائے تو اس سے یہ چھڑا نہیں سکتے ۔ عابد و معبود

---

۱۹ یونس : ۱۸

۲۰ الحج : ۷۳

دونوں کمزوریاں لئے گزرے ہیں۔

اس آیت کے اسلوب سے واضح ہوتا ہے کہ مشرکین سے مخاصمہ و بحث کی ایک کامیاب تدبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان کے طرزِ عمل کی غیر معقولیت کو طنز و نقد کی صورت میں واضح کیا جائے اور بتایا جائے کہ عقیدہ و فکر کی جس زمین پر تم پاؤں جمائے کھڑے ہو، وہ کھر بھری کمزور اور تضاد لیے ہوئے ہے۔ ان اصنام کے بارہ میں کہاں عقیدت و نیاز کا یہ عالم کہ ان سے منسوب بڑے بڑے ہیکل اور مندر تعمیر کیے گئے، ان کی کرامت اور خوارق سے متعلق عجیب و غریب قصے اور افسانے گھڑے گئے اور ان کے آگے جلال و احترام کے پیشِ نظر قربانی اور طرح طرح کے نذرانوں کے انبار لگائے گئے۔ یہی نہیں ان کی پرستش اور پوجا کو دینی شعائر کا جزو ترکیبی سمجھا گیا اور نہایت جرأت اور خیرہ چشمی سے ان تمام صفاتِ تقدیس کو جو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہیں، ان کے لیے بھی ثابت کیا گیا اور ان کو بھی اس کا اہل اور سزاوار قرار دیا گیا۔ کہاں یہ رتبۂ بلند اور کہاں پستی، عجز و بے چارگی اور ضعف و کمزوری کی یہ کیفیت، دوسروں کی مدد تو درکنار یہ اس لائق بھی نہیں کہ مکھی جیسی حقیر شی کو پیدا کر سکیں یا اس کے تصرفاتِ بے جا کا تدارک کر سکیں۔

اپنے مشرکانہ عقائد کی تائید میں گریز اور فرار کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ یہ اپنے گمراہانہ افکار کی ذمہ داری قضا و قدر کے فیصلوں پر ڈال دیں۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا۔ اگر ہم شرک کرتے ہیں تو اس میں بھلا ہمارا کیا قصور ہے، ہماری تقدیر میں یونہی لکھا تھا کہ ہمارے آباء و اجداد اور ہم شرک کریں، کیونکہ اگر خدا کو منظور ہوتا کہ ہم اس برائی سے دامن کشاں رہیں اور ان کے سوا کسی کی پرستش نہ کریں تو وہ ہمیں شرک کے ارتکاب سے روک دیتا۔

سیقول الذین اشرکوا لو شاء اللہ ما اشرکنا ولا آباءنا ولا حرمنا من شیئ [۲۱]

جو لوگ شرک کرتے ہیں وہ کہیں گے اگر خدا چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا ہی شرک کا ارتکاب کرتے۔

---

[۲۱] الانعام: ۱۴۷

ظاہر ہے استدلال کی اس صورت کو عذر لنگ ہی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ جب بات عقائد اور نظریات کی ہو جس کو انسان اپنے اجتہاد، سمجھ بوجھ اور اپنی پسند اور ذوق کے مطابق اپناتا ہے تو اس وقت قضا و قدر کی آڑ لینے کے بجائے بتانا یہ چاہیے کہ ان خیالات وافکار کو کن دلائل کی بنا پر قبول کیا گیا، یا وہ کون منطق ہے جس کو ان خیالات وافکار کی تائید کے سلسلہ میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس عذر کو قبول نہ کرتے ہوئے بجا طور پر فرمایا،

قل ھل عندکم من علم فتخرجوہ لنا[۲۲]

آپ اس کے جواب میں کہہ دیجیے کہ شرک کی تائید میں کوئی علمی سند تمہارے پاس ہو تو اس کو ہمارے سامنے پیش کرو۔ (تقدیر یا جبر و اضطرار کا بہانہ قطعی ماننے کے لائق نہیں)

عقیدہ توحید کے انوار و برکات سے دلوں کو منور کرنے کے سلسلے میں قرآن حکیم نے صرف مخاصمہ ہی سے کام نہیں لیا، بلکہ ایسا مثبت، معقول اور منطقی طرز فکر اختیار کیا جس کا جواب ممکن نہیں۔ یعنی اس کارخانۂ رنگ و بو کی بقا اور استواری کا راز یہی تو ہے کہ اس کے پیچھے وحدت ارادہ جلوہ طراز اور کارفرما ہے اور اگر کہیں بدقسمتی سے تعدد الٰہ کی صورت میں متعدد ارادے حرکت کناں ہوتے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا کہ ان میں باہم کشمکش اُبھرتی اور یہ حسین دنیا، یہ سرسبز و شاداب زمین اور یہ زرنگار آسمان اور ستارے یک لخت فنا اور گڑبڑ کا شکار ہو جاتے۔

لو کان فیھما اٰلھۃ الا اللہ لفسدتا[۲۳]

اگر زمین اور آسمان میں اللہ کے سوا اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔

علاوہ ازیں ان کی نفسیات، غیرت و حمیت کو بھی جھنجھوڑا اور حضرت یوسف کی زبان میں پوچھا کہ تم جو اپنی تنہا حکمرانی اور بلا شرکت غیرے اقتدار کے خواہاں ہو، اللہ تعالیٰ کے لیے کیوں شریک و سہیم ڈھونڈتے ہو۔ کیا تمہارے نزدیک ایک اللہ کا تصور زیادہ قرین قیاس، زیادہ صحیح اور

---

۲۲ الانعام : ۱۴۸ — ۲۳ الانبیاء : ۲۲

تمھاری اپنی خواہشات اور آرزوؤں کے قریب تر نہیں ؟

یاصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیرام اللہ الواحد القھار۔[۲۴]

اے میرے بندی خانے کے دوستو۔ بتاؤ کہ جدا جدا اور متعدد خداؤں کا وجود بہتر ہے۔ یا ایک خدا کا جو غالب اور با اختیار ہو۔

مشرکینِ مکہ سے قرآن حکیم کے مخاصمہ کی نوعیت صرف اعتقادات ہی تک سمٹی ہوئی نہیں بلکہ اس کے دائرے ان کی معاشرتی اور اخلاقی زندگی تک وسعت پذیر ہیں۔ یعنی قرآن حکیم نے جہاں ان کی ان گمراہیوں سے تعرض کیا ہے جن کا تعلق عقیدۂ توحید کے جادہ استوار سے انحراف سے ہے وہاں ان برائیوں پر بھی متنبہ کیا ہے جن سے انسانی اخلاق اور رشتے متاثر ہوتے ہیں اور اچھے خاصے معاشرہ میں ناہمواری اور ظلم کے داعیے پرورش پاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں سرفہرست اور سب سے اہم جو برائیاں ہیں ان میں ہم غلامی، ربا، شراب خوری اور عورتوں کے بنیادی حقوق سے تغافل اور پامالی کے چار خانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

غلامی کے بارہ میں تہذیب و تمدن کی ستم ظریفی کا یہ پہلو کس درجہ ہولناک اور سنگ دلی پر مبنی ہے کہ اسلام سے پہلے کسی نظامِ حیات میں اس کے غیر انسانی اور غیر اخلاقی پہلوؤں پر غور نہیں کیا گیا۔ یہی وجہ ہے بائبل میں متعدد آیات میں اس کے جواز پر مہر تصدیق ثبت کی گئی ہے۔ عیسائیت جس کے پہلو میں دل دردمند ہے اور جو محبت، پیار اور بنی نوع کی ہمدردیوں کی دعویدار ہے۔ نہ صرف اس مسئلہ پر خاموش ہے بلکہ اس کی مؤید ہے اور بجائے اس کے کہ آقاؤں کے ظلم کے خلاف آواز اٹھائے الٹا غلاموں کو تلقین کرتی ہے کہ وہ آقاؤں کی پیروی میں اخلاص کا برتاؤ روا رکھیں۔ رومی قانون کی مقبولیت کا بڑا شہرہ ہے مگر اس میں بھی غلاموں کو صرف جائداد اور ذریعۂ معاش کا درجہ دیا گیا ہے۔ یہی نہیں رومی قانون کے مطابق تو مالک غلاموں کو کسی بھی جرم پر جان سے بھی مار سکتا ہے۔

سقراط، فلاطون اور ارسطو کے ان عظیم فلسفیانہ نظریات اور تحقیقات میں بھی جن میں

---

[۲۴] یوسف : ۳۹

فکر و ذہن کی تمام تر پابندیوں کی نشاندہی کی گئی ہے، ان کی فلاح و بہبود سے متعلق کسی احساس کا تذکرہ تک نہیں ملتا۔ یہی حال ہندوستان، مصر اور ایران کے دینی اور تہذیبی نظریات کا ہے۔ ان میں منطق، فلسفہ، ریاضی۔ فلکیات۔ علم التعمیر۔ جر اثقال اور اجتماعی زندگی سے متعلق کیا کیا پہلو واضح نہیں کیے گئے۔ لیکن انسانی قساوتِ قلبی کا یہ منظر کس درجہ دل ہلا دینے والا ہے کہ ان سب ہی انسان کے بارہ میں اس کھلے ہوئے ظالمانہ طرز عمل کے خلاف کسی نے بھی لب کشائی نہیں کی

ان تمام نظام ہائے حیات میں یہ شرف اسلام اور صرف اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے پہلی دفعہ غلامی کے مسئلہ کو انسانیت کا مسئلہ قرار دیا اور اس کے استیصال کے لیے مثبت اور مفید قدم اُٹھائے اور تدریج و عمل کا ایسا نقشہ تجویز کیا کہ جس سے یہ بُرائی آپ سے آپ دور ہو جائے۔ اس طرح کے انسانی حقوق کی حفاظت وصیانت سے متعلقہ مسائل کی تشریح و توضیح سے متاثر ہوکر قرآن کے ایک مترجم مونتہ (Montet) کو کہنا پڑا۔ کہ "محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا نام ہی بجا طور پر اس لائق ہے کہ اس کو ان مصلحین میں شمار کیا جائے جنھوں نے بگڑی اور کچلی ہوئی انسانیت کو رشد و ہدایت کی روشن راہ دکھائی"[۲۵]

قرآنِ حکیم نے غلامی کے استیصال کے لیے تدریج و عمل کی کیا تدبیر اختیار کی۔ اس کی تفصیل جاننے کے لیے ان نکات پر غور کرنا ضروری ہے :

۱۔ قرآنِ حکیم نے توحید کا صاف ستھرا تصور پیش کر کے ثابت کیا کہ انسان اور انسان میں فرق و امتیاز کی جو دیواریں حائل ہیں ان کو گرا دینا چاہیے کیونکہ عند اللہ سب انسان حرمت و اکرام کے لحاظ سے برابر اور یکساں ہیں :

ولقد کرمنا بنی آدم[۲۶]

اور ہم نے بنی آدم کو شرف و احترام بخشا ہے۔

---

[۲۵] الثقافۃ الاسلامیہ والحیاۃ المعاصرہ۔ مقالہ الاستاذ مصطفی احمد زرقاد، ص ۱۰

[۲۶] الاسراء : ۷۰

(۲) قرآنِ حکیم نے فضیلت و بزرگی کے فرسودہ پیمانوں کو جو رنگ، نسل اور دولت و ثروت پر مبنی تھے بدل کے رکھ دیا۔ اور یہ کہا کہ معاشرہ میں انسانی مرتبہ کا تعین کردار اور صرف کردار سے ہوتا ہے، انسان کے مفروضہ معیاروں سے نہیں۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم[۲۷]

تم میں اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ زیادہ معزز ہے جو زیادہ وصف و اتقاء سے اتصاف پذیر ہے۔

(۳) امرا اور صاحب حیثیت لوگوں کو اس پر آمادہ کیا کہ وہ غلاموں آزادی کی نعمت سے بہرہ مند کریں۔

الم نجعل لہ عینین ٥ و لسانا و شفتین ٥ وھدینہ النجدین فلا اقتحم العقبۃ ٥ وما ادراک ما العقبۃ ٥ فک رقبۃ[۲۸]

کیا ہم نے اس کو دو آنکھیں نہیں دیں، زبان اور دو ہونٹ نہیں بخشے۔ ہم نے اس کے علاوہ اس کو خیر و شر کی دونوں راہیں سجھا دیں۔ اس کے باوجود اس نے گھاٹی کو کیوں عبور نہیں کیا۔ جانتے ہو یہ گھاٹی کیا ہے کسی غلام کو آزادی سے ہم کنار کرنا۔

(۴) صدقات کے جملہ مصارف میں سے ایک مصرف غلاموں کی آزادی و مخلصی کو خصوصیت سے متعین فرمایا۔

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملئکۃ والکتاب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب[۲۹]

نیکی یہی نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف اپنا منہ کر لو بلکہ نیکی (کی روح) یہ ہے کہ لوگ خدا پر اور روزِ آخرت پر اور فرشتوں پر اور خدا کی کتاب پر اور پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں (خرچ کریں)۔

---

[۲۷] الحجرات : ۱۳ [۲۸] البلد : ۱۳ [۲۹] البقرۃ : ۱۷۷

(بعض ان جرائم اور عصیاں کی صورتوں میں جو عرب معاشرہ میں عام تھے، کفارہ کی ایک صورت یہ بھی رکھی کہ غلاموں کو آزادی کی نعمت سے مالامال ہونے کا موقع عطا کیا جائے تاکہ بتدریج یہ بُری رسم خود بخود ختم ہو جائے۔

قتل خطا کے بارہ میں فرمایا:

ومن قتل مؤمنا خطاءً فتحریر رقبة مومنة[30]

اور جو بھول کر مؤمن کو قتل کر دے تو (دیت کے علاوہ) وہ ایک غلام آزاد کر دے۔

قسم کی خلاف ورزی کی صورت میں ارشاد فرمایا:

لا یؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما عقدتم الایمان فکفارته اطعام عشرة مسٰکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبة[31]

خدا تمہاری بے ارادہ قسموں پر مواخذہ نہ کرے گا۔ لیکن پختہ قسموں پر مواخذہ کرے گا۔ ان کی خلاف ورزی کی صورت میں دس مسکینوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل و عیال کو کھلاتے ہو۔ یا ان کے لیے لباس مہیا کرنا ہے اور یا ایک غلام آزاد کرنا۔

(۶) غلامی کے باوجود اسلام نے ان کے روحانی اور اجتماعی درجہ و مرتبہ کو معاشرہ میں اس حد تک بلند کر دیا کہ ان میں اور مرد حُر میں عملاً کوئی فرق نہ رہا۔

حدیث میں ہے[32]:

العبید اخوتکم فاطعموھم ما تأکلون۔

یہ غلام تمہارے بھائی ہیں۔ انہیں وہی کھلاؤ پلاؤ جو تم خود کھاتے پیتے ہو۔

(۷) ان تعلیمات کے ساتھ ساتھ شریعتِ اسلامی نے اس بات کا بھی اہتمام کیا کہ غلاموں کو حصولِ آزادی کا باقاعدہ قانونی حق بھی عطا کیا جائے۔ اسے فقہ کی اصطلاح میں 'مکاتبت' کہتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ غلام مقررہ رقم ادا کر کے آزاد ہو۔

(باقی آئندہ)

---

[30] النساء: ۹۲ [31] المائدہ: ۸۹ [32] صحیح بخاری ک ۴۹ ب ۱۵ تا ۱۸